بحث و نظر

اِنسدادِ مُنکرات ـــــ ایک وضاحت

جناب محمد نواز صاحب - رحیم یار خان

ترجمان القرآن (جنوری) میں جناب نور الٰہی ایڈووکیٹ نے میرے اس مضمون پر، جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعلق تھا، گرفت فرمائی ہے۔ اس لیے میں ان کا شکر گزار ہوں، کیونکہ ان کی وجہ سے مجھے اس موضوع پر مزید غور و فکر کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

چند باتیں وضاحتاً عرض کیے دیتا ہوں امید ہے کہ ان سے جناب نور الٰہی صاحب کی غلط فہمی دور ہو جائے گی:

۱- قرآنِ حکیم کی کسی آیت کا انسانی زبان میں ترجمہ کرنے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس ترجمہ کو سو فی صد منشائے الٰہی کے مطابق قرار دیا جائے۔ یا وہ ترجمہ آیت کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ اس معاملہ میں خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی جائے اصل اور ترجمہ میں فرق بہر حال موجود رہے گا۔ لہٰذا اگر کسی آیت کے ترجمہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ متعلقہ آیت کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں تو یہ بات کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہونی چاہیے۔

قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کا جو ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے، اس میں تراجم کے اختلاف سے انکار ممکن نہیں۔ اگر صرف سورۂ بقرہ کی آیت .... اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ ...... کے مختلف ترجموں کا موازنہ کیا جائے تو حقیقتِ حال خود بخود منکشف ہو جائے گی۔

۲- تراجم کا یہ اختلاف "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے بارے میں بھی موجود ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت..... وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ.....
(الآیۃ ۱۰۴) کے مختلف ترجمے ملاحظہ ہوں:

۱۔ "اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ایک جماعت بلاویں طرف بھلائی کے اور حکم کریں ساتھ اچھی چیز کے اور منع کریں نامعقول سے اور یہ وہی ہیں چھٹکارا پانے والے۔" (شاہ رفیع الدینؒ)

۲۔ "اور چاہیے کہ رہیں تم میں، ایک جماعت بلاتے نیک کام پر اور حکم کرتے پسند بات پر اور منع کرتے ناپسند کو اور وہی پہنچے مراد کو۔"
(شاہ عبد القادرؒ)

۳۔ "اور چاہیے کہ تم میں ایک جماعت ہو، جو نیک کام کی طرف بلاتی رہے اور اچھے کام کا حکم کرتی رہے اور بُرے کاموں سے روکتی رہے...."
(مولانا احمد علی لاہوری)

۴۔ "اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت جو بلاتی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرتی رہے بُرائی سے اور وہی پہنچے مراد کو۔" (شیخ الہندؒ)

۵۔ "اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کام کا اور منع کرتی رہے بُرائی سے۔"
(مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

۶۔ "اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ رہے جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔" (مولانا امین احسن اصلاحی)

۷۔ "تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں بھلائی کا حکم دیں اور بُرائیوں سے روکتے رہیں۔" (سیّد مودودیؒ)

راقم الحروف کو اپنی علمی بے مائیگی کا اعتراف ہے، مگر اس کے باوجود بصد ادب و احترام یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ان میں سے کوئی ترجمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کے جامع مفہوم پر حاوی نہیں ۔ اگر ایک بزرگ نے معروف کا ترجمہ "اچھی چیز" کیا ہے تو دوسرے نے "پسند بات" لکھا ہے ۔ اگر کوئی معروف کو "اچھے کاموں کے معنی میں استعمال کرتا ہے تو دوسرے کے نزدیک "نیک کام" ہے ۔ کسی نے اس کا ترجمہ صیغہ "واحد" میں کیا ہے تو کسی نے "جمع" میں ۔ صاحب تفسیر قادری نے "یَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ..... (آل عمران - ۱۱۴) کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے :

"حکم کرتے ہیں خلق کو تصدیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ، ساتھ امورات شرع کے اور منع کرتے ہیں تکذیب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یا تمام نہیات سے ۔"

"معروف" قرآن مجید کی بڑی اہم اصطلاح ہے ۔ اس کا تعلق دین کے بنیادی فرائض سے ہے ، مگر ان مختلف ترجموں میں (..... بصد معذرت) سے قرآن کی مخصوص اصطلاح نہیں رہنے دیا گیا ۔ اسے عام لفظ سمجھ کر لغت کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔ جس کی وجہ سے معروف کا جامع مفہوم نکھر کر سامنے نہیں آتا ۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہوئی کہ آیا معروف محض "نیکی" اور "بھلائی" کا نام ہے یا نیکیوں کے مجموعہ کو "معروف" کہتے ہیں ، اور یا پھر اس سے مراد وہ "المعروف" ہے جو ساری نیکیوں کا منبع و مصدر ہے جس سے خیر کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں ۔ یہی معاملہ "منکر" کے مفہوم کا بھی ہے آیا اس سے کوئی خاص منکر یا منکرات کا سارا کنبہ مراد ہے یا اس سے وہ "المنکر" مراد ہے جو ساری برائیوں اور خرابیوں کی بنیاد ہے ۔

اس بارے میں لغت ہماری مدد نہیں کرتی اور تراجم بھی اس کا جامع مفہوم بیان کرنے سے عاجز ہیں ۔ لہٰذا اس کا جامع مفہوم سمجھنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ کی سیرت طیبہ اور سنت مطہرہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا ۔ کیونکہ قرآن اپنی مخصوص اصطلاحات کی یا تو خود تشریح کرتا ہے یا پھر اس کی اصطلاح کے مفہوم کو صرف سنت ، سیرت یا جماعت صحابہؓ کے اجتماعی عمل سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ قرآن کی مخصوص اصطلاحات کی تشریح کے

لیے محض عربی لغت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ قرآنی اصطلاحات کی تفہیم کے لیے اصل ڈکشنری یا لغات صرف اور صرف سنت ہی ہے۔ سنّت ہی سے "معروف"، "منکر" اور "اُمت" جیسے الفاظ کے معنی معلوم ہوں گے۔ اور سنّت ہی سے "اقامتِ صلوٰۃ"، "فعلِ زکوٰۃ"، "بر" اور "تقویٰ" جیسی اصطلاحات کی تشریح ہوتی ہے۔ ان اصطلاحات کا نہ تو کلامِ عرب سے کوئی تعلق ہے کہ ان کے سمجھنے کے لیے اس سے نظائر تلاش کی جائیں۔ اور نہ زبان و ادب کی باریکیوں اور لطافتوں میں جانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیت کا جامع مفہوم وہی مستند ہوگا جس کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیبہ سے ہوگی۔

۳۔ تفہیم القرآن کی "فہرست موضوعات" دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں سات آیات ایسی ہیں جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر ہوا ہے۔ تین آیات سورۂ آل عمران میں ہیں (۱۰۴۔۱۱۰۔۱۱۴) ایک آیت (۱۹۹) سورۂ الاعراف میں، ایک سورۂ توبہ (۷۱) میں، ایک سورۂ الحج میں (۴۱) اور ایک سورۂ لقمان (۱۷)۔ ان میں صرف سورۂ الاعراف اور سورۂ لقمان کی آیات مکّی ہیں، باقی ساری آیات مدنی ہیں۔ مکّی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ ہی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ پر عمل کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، سورۂ اعراف میں یہ ہدایت ان الفاظ میں موجود ہے:

"درگذر کرو، نیکی (معروف) کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔"

(تدبر قرآن)

سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا تھا کہ یہ فریضہ معمولی نوعیت کا نہیں، بلکہ بڑا اہم ہے۔ اس راہ میں مصائب کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا۔ یہ عزم الامور میں سے ہے اور "یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے، اصلاحِ خلق کے لیے اُٹھنا اور اس کی مشکلات انگیز کرنا، کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ ان کاموں میں سے ہے جن کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔" (تفہیم القرآن ۴۰ حاشیہ ۳۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور کا افتتاح اس دعوت سے فرمایا:
"اے لوگو! کہدو کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں تو کامیاب ہو جاؤ گے، عرب کے حکمران بن جاؤ گے۔ عجم تمہارے ماتحت ہو جائیں گے اور جب تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں بھی بادشاہ بن جاؤ گے[1]"

نیکی اور بھلائی کے اور بھی کئی کام موجود تھے، مگر آپ نے پہلے قدم پر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کی دعوت دے کر پورے جاہلی نظام کو رد کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے معروفات میں سے کسی کی طرف اتنے تسلسل کے ساتھ دعوت نہیں دی، جتنی اس کلمہ کی بالا دستی کی دعوت پر اصرار کیا۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہی دعوت ہی سب سے بڑا معروف ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کا اختتام دعائے ہجرت پر ہوتا ہے۔ جس میں بڑے معروف کی طلب آپ کی دعا کے اس جملہ میں ڈھل گئی۔ وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا۔ یعنی کسی طاقت کو میرا مددگار بنا دے"۔

یہاں "سلطان" سے مراد بھی یہی "المعروف" یا معروفِ اعظم ہے۔ امام المفسرین ابن جریر نے حسن بصری اور قتادہ کے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ اس آیت میں "سلطان" سے مراد "اقتدار، غلبہ اور حکومت ہے[2]" حافظ ابن کثیر نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ[3] فرماتے ہیں کہ "حکومتِ اسلامیہ دین کا بلند ترین فرض اور واجب ہے۔ بلکہ اس کے بغیر دین قائم ہو ہی نہیں سکتا"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعۂ سیرت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی ساری مساعی جمیلہ کا ہدف المعروف یعنی دین کا غلبہ اور اس کی حکومت کا قیام تھا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت مدینہ

۱-۲-۳ - حاشیہ - بحوالہ اسلامی سیاست از مولانا گوہر الرحمن ص ۱۶۹-۱۱۲-۱۳۸-

میں قائم فرمائی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کلمہ کی حکومت کے قیام کا اعلان آپؐ کی بعثت ہی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ نبی جب مبعوث ہوتا ہے تو اس کی بعثت کی حیثیت موجود الوقت نظام کے مقابلے میں ایک الگ نظام، اور موجود الوقت ریاست و حکومت کے متوازی اور اس کے مخالف ایک الگ ریاست و حکومت کی ہوتی ہے۔ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ طیبہ کی دعوت کے ذریعے اپنی الگ ریاست و حکومت کے قیام کا اعلان فرمایا، اور اپنے وقت کے جاہلی نظام کو رد فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ریاست کو صرف خطۂ ارض کی ضرورت تھی، اس مقصد کے لیے آپ نے اہلِ مکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے جاہلی اقتدار سے دست بردار ہو کر آپ کی اطاعت پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر انھوں نے مزاحمت کی، اس بات کو آپؐ نے اہلِ طائف کے سامنے رکھا، وہ بھی مخالف ہو گئے۔ آپؐ نے اس مقصد کے لیے اللہ سے دعا کی کہ وہ اقتدار کے ذریعے مدد کرے چنانچہ وہ دعا قبول ہوئی، مدینہ میں آپؐ کو تمکن فی الارض[1] نصیب ہو گیا۔ جماعتِ صحابہؓ کو "خیر امت"[2] کا لقب ملا اور بنی اسرائیل کو انسانیت کی امامت کے منصب سے معزول کر کے اس پر امتِ مسلمہ کو فائز کر دیا گیا۔[3]

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض مکہ کی نظریاتی ریاست کے لیے مقرر کیے تھے وہی فرائض تمکن کے بعد مدینہ کی ریاست کے بھی تھے۔ مکہ میں بھی اقامتِ صلوٰۃ، فعلِ زکوٰۃ یعنی تزکیۂ نفوس بذریعہ انفاق، کمزوروں کی مدد اور دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل ضروری تھا۔ اسی طرح مدینہ میں بھی اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ریاست و حکومت کے لازمی وظائف قرار دیے گئے۔ گویا "المعروف" مکہ میں بھی تھا، مگر اس کے پاس کوئی خطۂ زمین نہ تھا، اس کے حصول کے لیے کوشش کی گئی، "المعروف" مدینہ میں

---

[1] الحج - ۴۱
[2,3] تفہیم القرآن حاشیہ ۸۸

بھی موجود نہ تھا، یہاں اس کے پاس زمین موجود تھی۔

"المعروف" دراصل عقیدہ و ایمان کی ریاست کا نام ہے، وہ بغیر کسی خطۂ ارضی کے آج بھی موجود ہے۔ اس کا اپنا الگ دستور، اپنا الگ نظامِ عبادت و اطاعت اپنا نظامِ قانون اور اپنی الگ تہذیب و ثقافت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس المعروف کو کسی خطۂ زمین پر مکمل ـــــ تمکن حاصل ہو، اس بات کا انحصار اُمّت کی تنظیم، اتحاد اور طاقت پر ہے۔

۵۔ یہاں خود اس اُمّت کی ہیئتِ ترکیبی پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ جس پر" المعروف" کے قیام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اُمّت کلمہ گو افراد کے منتشر، بے امام اور مقہور و مغلوب گروہ کا نام نہیں۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مسلمانوں میں کوئی ایسا گروہ پایا جاتا تھا اور نہ کوئی ایسا گروہ نزول قرآن کے وقت سورہ آل عمران کی متعلقہ آیات کا مخاطب تھا۔

"اُمت" ـــــ دراصل مسلمانوں کے اس گروہ کا نام ہے جس میں امامت، قیادت، خلافت یا امارت کا نظام علیٰ منہاج النبوۃ و علیٰ طریق خلفائے راشدین قائم ہو، اس میں سمع و طاعت کا نظام موجود ہو، وہ متحد ہو، اُسے اقتدار اور حکومت حاصل ہو اور اسے "امر" اور "نہی" کے نفاذ پر قدرت حاصل ہو۔ اگر خدانخواستہ کسی وقت کسی حادثہ کی صورت میں یہ حالت برقرار نہ رہے اور قیادت و امامت کا تسلسل ٹوٹ جائے تو اس صورت میں وہ گروہ "اُمّت" کے لقب کا مستحق ہوگا۔ جو اس میں اتحاد پیدا کرنے اور اس میں امامت یا امارت کی بحالی یا اس کے نظامِ عبادت و اطاعت کے قیام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہے گا۔

کیونکہ انتشار اور فساد کی صورت میں دین کے کسی بھی فریضہ، حتیٰ کہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور حج جیسی عبادات پر سنّت کے مطابق عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ دین کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور توحید اور رسالت جیسے اساسی عقائد کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ انتشار اور فساد کی صورتِ حال

پر مطمئن ہو کر زندگی بسر کرنا عقیدہ و ایمان کی موت کے مترادف ہے۔

دین کے فرائض کی بجا آوری کے لیے اُمت کا اتحاد اور اس کا غالب و حکمران ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سید قطب شہید نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ایک جماعت ناگزیر ہے جو خیر کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اسی طرح زمین پر اقتدار — بھی ناگزیر ہے جو خیر کی دعوت دینے والا ہو، معروف کا حکم کرنے والا اور منکر سے روکنے والا ہو"۔

اگر کسی حادثہ کے باعث اُمت کا شیرازہ منتشر ہو جائے تو پھر دین و ایمان کے بچاؤ کے لیے دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اور یہ دونوں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہیں۔ فرمایا:

"جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ اُمت میں بہت سارے اختلافات دیکھیں گے۔ ایسے وقت میں تمہارے لیے ضروری ہو گا کہ میری "سنّت" اور برسرِ ہدایت خلفائے راشدین کی سنّت" کو مضبوطی سے اور دانتوں سے پکڑے رہو" (ابوداؤد)

صاف ظاہر ہے کہ اس حدیث سے "سنّت" کا وہ مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا جو عام طور پر معلوم اور مشہور ہے۔ اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی اور مدنی حیاتِ طیبہ کا پورا اسوہ اور عمل ہے۔ اور خلفائے راشدین کی سنّت سے بھی ان کے دَورِ اقتدار و حکومت کا اجتماعی عمل مراد ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنّت کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

۱۔ آپ نے المعروف کے قیام کی دعوت دی، جاہلی نظام کو رد کر دیا، اور وقت کے جاہلی اقتدار سے مطالبہ کیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے تابع ہو جائے۔ المعروف کے تمکّن کے لیے خطۂ زمین حاصل کر کے اُسے سارے جزیرۃ العرب میں غالب کر دیا۔

۲۔ اُمت کی تنظیم و تربیت کے لیے اقامتِ صلوٰۃ اور فعلِ زکوٰۃ کو رائج فرمایا اور اسے ایک مکمل نظامِ عبادت و اطاعت کے تابع کر دیا۔

۳۔ المعروف کے تمکّن و اقتدار کے بعد آپؐ نے معروفات کو فروغ دیا، جرائم کا انسداد فرمایا، امنِ عامہ کو قائم کیا، اشرار کی سرکوبی کی، "امر" اور "نہی" کو نافذ فرمایا اور اسلامی ریاست کی سرحدوں کے تحفّظ، دفاع اور توسیع کے لیے جہاد کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس سنّت کے پانچ عنوانات خود ہی قائم فرمائے اور اُمّت کے ہر فرد کو حکم دیا کہ وہ ان پانچ باتوں کو اپنے اُوپر لازم ٹھیرائے، فرمایا:

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعتی زندگی، سمع (احکام سُننا)، اطاعت (حکم ماننا) ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ"۔ (مشکوٰۃ)

حقیقت یہ ہے کہ یہ پانچوں باتیں ہی دراصل آپ کی جامع سنّت ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تمام سنن اس جامع سنّت کے ساتھ تسبیح کے دانوں کی طرح جُڑی ہوئی ہیں۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱۔ معروف سے مراد المعروف ہے۔ اگر یہ اقتدار کی طاقت سے محروم ہو تو امر بالمعروف کا مطلب اس کے اقتدار کو قائم کرنے کی جدوجہد ہوگی۔ اس صورت میں یہ فریضہ تحریکِ اقامتِ دین کے مترادف ہوگا۔ سورۂ اعراف (۹۹) اور سورۂ لقمان (۱۷) کی متعلقہ آیات کے نزول کے وقت یہی صورت موجود تھی۔

۲۔ اگر "المعروف" قائم ہو تو پھر امر بالمعروف کا مطلب ہوگا۔ المعروف کے واسطہ و وسیلہ سے "امر" اور "نہی" کا نفاذ۔ اس صورت میں یہ اسلامی حکومت کے ہم معنی ہوگا۔ سورہ آلِ عمران کی آیات (۱۰۴ - ۱۱۰) اور سورہ الحج کی آیت (۴۱) کے نزول کے وقت یہی صورت موجود تھی۔

۳۔ اوّل الذکر صورت میں "جماعت" کا ہونا ضروری ہے۔ اور مؤخر الذکر کی صورت میں اس جماعت کے لیے حکومت و اقتدار کا ہونا ناگزیر ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ وہ مفہوم ہے جو قرآن مجید کے مختلف ترجموں[1] سے کما حقہٗ ظاہر نہیں ہوتا۔ راقم الحروف کے ذہن میں اس کے بارے میں اشکال تھا، اُسے دُور کرنے کے لیے راقم الحروف نے وہ ترجمہ بطور تجویز تحریر کیا جس پر جناب نور الٰہی صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ راقم کو اپنے اس ترجمہ کے جامع ہونے پر قطعی اصرار نہیں اور نہ وہ اس ترجمہ کا دفاع ہی کرے گا۔

رہی یہ بات کہ متعلقہ آیت کے ترجمہ میں "ب" کا استعمال بطور استعانت یا واسطہ و وسیلہ کے صحیح ہوا ہے یا غلط۔ اس بحث کا کوئی حاصل نہیں اور نہ اب اس کا موضوع زیر بحث سے کچھ زیادہ تعلق باقی رہا ہے۔ اصل قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ مفہوم جو ان سطور میں بیان کیا گیا ہے، اگر صحیح ہے تو بحث ختم! ان سطور کا راقم، نہ تو مفسر ہے، نہ مترجم اور نہ ماہر لسانیات، وہ صرف علم صحیح اور فہمِ قرآن کا گداگر ہے اور اہلِ علم کا خوشہ چیں ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو صرف "ترجموں" تک محدود ہے۔ جہاں تک "امر بالمعروف کی تفسیر" کا تعلق ہے اس سے مکمل اتفاق ہے۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں۔ "معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں فرض ہے کہ ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کو اور دین کا تقید رکھنے کو تا خلافِ دین کوئی نہ کرے"۔ اسی طرح آل عمران آیت ۱۱۰ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "یعنی یہ اُمت بہتر ہے اسی دو صفت میں امر بالمعروف یعنی جہاد اور ایمان یعنی توحید کا تقید اس قدر اور دین میں نہیں"۔ اُردو کے بعض مفسرین نے امر بالمعروف کی تفسیر "جہاد" یا "توحید، رسالت اور معاد" کی دعوت ہی کے معنوں میں کی ہے۔